رفیق سندیلوی

راجہ گدھ ۔ ایک فکری ناول

بانو قدسیہ نے اپنے ناول " راجہ گدھ " کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے ۔ شام سے 'عشق لا حاصل' دن ڈھلے 'لا متناہی تجسس اور دن چڑھے ' رزق حرام ' ۔ عشق لا حاصل ' لا متناہی تجسس اور رزق حرام ' یہ تینوں عناصر مل کر انسان میں دیوانگی کی قوت کو نمو دیتے ہیں ۔ بانو قدسیہ نے گدھ کی علامت کے حوالے سے انسانی دیوانگی کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے ۔ ہر چند کہ گدھ کی علامت حیوانی سطح کی حامل ہے اور انسان حیوانی سطح سے بلند تر ہستی ہے اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ گدھ کی مردار خوری اور اس پس منظر میں ابھرنے والی بے چینی اور دیوانگی انسان کے تشخص سے کس حد تک مشابہ ہے ۔ گدھ کی علامت اس لئے رد نہیں کی جا سکتی کہ اقبال نے مرد مومن کو شاہین کی علامت دی تھی ۔ گو کہ شاہین کی سرشت میں فرومایہ پرندوں پر جھپٹنے اور ان کا شکار کرنے کی خو موجود ہوتی ہے ' اقبال نے صرف شاہین کی آزادی خودداری اور بلند نگاہی کو ہی علامتی شکل میں وصول کیا تھا ۔ علامت کے تمام تر پہلو یکساں اور مماثل تو نہیں ہو سکتے ۔ یہاں بانو قدسیہ نے راجہ گدھ کی علامت کو وضع کرنے کے لئے پرندوں کے اجلاس کا ایک پورا پس منظر مہیا کر دیا ہے ' چونکہ گدھ کی علامت نئی تھی اور بغیر کسی تمثیلی تناظر کے علامتی اطلاق کا جواز نہیں رکھتی تھی سو اسی لئے پرندوں کے اجلاس کا انعقاد معنی خیز بن جاتا ہے اور اس کے ذریعے مختلف النوع پرندوں کی عالمانہ باتوں سے دیوانگی کے پہلوؤں پر روشنی بھی پڑتی رہتی ہے اور ساتھ ہی گدھ جاتی اور کرگس جاتی کی اصطلاحیں بھی فراہم ہو جاتی ہیں 'قوم اور اس قبیل کے انسانوں پر جن کا اطلاق نامانوسیت بھی پیدا نہیں کرتا ۔ گدھ کی علامت اسفل ترین انسان کے لئے ہی وضع کی گئی ہے ' جو اپنے پس منظر میں قریبی مناسبت رکھتی ہے ۔

راجہ گدھ کے مقدمے اور اس ضمن میں پرندوں کی وکالت سے متعلقہ مواد کو ناول کے وقوعاتی تسلسل میں مناسب جگہ دی گئی ہے جس سے یہ مواد ناول کا ایک ایسا جزو بن گیا ہے جو دلچسپ اور مربوط بھی ہے اور اپنے سیاق وسباق میں ناول کی بنت کے اس تخلیقی حسن کا غماز بھی ہے جس نے ایک مخصوص تکنیک اور ایک مخصوص تفکر کے انضمام سے وجود پایا ہے اور جس کی نمود میں بانو قدسیہ کے طویل ادبی تجربے کو بھی خاصا دخل ہے ۔ یقیناً اس سلسلے میں مصنفہ نے ذہانت کے ساتھ پیشگی منصوبہ بندی سے کام لیا ہے ' جس نے ایک طرف تو ناول کو بے مہار ہونے سے بچائے رکھا ہے اور دوسری طرف نظریات کی پیشکش میں رکاوٹ بھی پیدا نہیں ہونے دی ' قطع نظر اس سے کہ نظریات کی حیثیت قابل قبول ٹھہرتی ہے یا ناقابل تردید ۔

بانو قدسیہ کے نزدیک دیوانگی دو طرح کی ہے ۔ ایک وہ دیوانگی جس کا انجام مکمل پاگل پن ہے اور دوسری دیوانگی کی وہ شکل ہے جو روح کو توانائی عطا کرتی ہے اور الہام پر منتج ہوتی ہے مگر بانو کے نزدیک المیہ یہ ہے کہ دیوانگی کی دوسری شکل کو بھی پاگل پن ہی سمجھ لیا جاتا ہے ۔ کچھ لوگ دیوانگی کے اس زینے پر پہنچ جاتے ہیں جہاں حالت استغراق اور کیفیت الہام کا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے جیسے یہی ' آفتاب کے بارے میں بغیر دیکھے ہی تصور کر لیتی ہے کہ اس کی ٹھوڑی پر شیو کرتے

وقت کٹ لگ گیا ہے' بعد میں قوم جسکی تصدیق کر دیتا ہے 'مگر یہ Sensitivity کی ابتدائی نیج ہے۔ بعض لوگ بچپن ہی سے کشفی طاقتوں سے متصف ہوتے ہیں مگر انہیں عام پاگلوں کی قطار میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ آفتاب کا بیٹا افرہیم ایسا ہی بچہ ہے جو کبھی مدینے نہیں گیا لیکن کہتا ہے۔

"وہ دیکھئے ابو کبوتر اڑ رہے ہیں' مدینے کی سڑکوں پر لوگ بھاگ رہے ہیں۔ اس گنبد کی طرف.... روسی 'امریکی .... افریقی' اذان ہو رہی ہے ابو.... آپ کو لوگ بھاگتے نظر نہیں آتے ؟ کیا آپ واقعی اذان کی آواز نہیں سن سکتے۔ وہ دیکھئے چار مئوذن ایک ہی وقت میں اذان دے رہے ہیں۔"

ایسے بیان کی مدد سے ذہن انسانی کے عالم مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی پیشگی شبیہ بنا سکتے ہیں۔ ذہنی و روحانی تجربات کو تنقیدی زاویے سے جانچنے اور پرکھنے کی روشن تاریخ اسلام میں بھی نظر آتی ہے۔ خود نبی آخر الزماں نے ابن صیاد نامی ایک نو عمر یہودی کی وجدانی کیفیات اور پیش گویانہ مدرکات کا مشاہدہ و مطالعہ کیا تھا۔ آپ نے اس کے ذہنی و لاشعوری واردہ پر سوالات کئے تھے اور اس کی مختلف نیمـــــاتی کیفیات کا جائزہ لیا تھا۔ سو بعض صورتوں میں افرہیم جیسے افراد کے تحیر کن کشفی بیانات علم وسائی کا ذریعہ بھی بن سکتے ہیں۔ تاہم یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ بعض کشفی اور الہامی کیفیات دائرہ مسلمات میں آتی ہیں استغراق' واہمہ' ہلیلسو کی نیشن اور تشنج کی بعض حالتوں میں سرے سے روحانی تجربے کا وجود ہی نہیں ہوتا کہ اسے من جانب اللہ قرار دیا جائے۔ بہرحال بانو قدسیہ کی سوچ نے ابنارمل اور پیرانارمل افراد کے پیغامات و واردات کے مابین خط تفریق کھینچا ہے اس حوالے سے بانو قدسیہ نے ایک باریک اور اہم نکتے کی طرف اشارہ کر کے ذہن انسانی کو ایک نئی جہت پر کام کرنے کی طرف موڑا ہے اور خوش کن بات یہ ہے کہ ناول کے زبان و اسلوب میں یہ باتیں بھلی محسوس ہوئی ہیں۔

اس ناول میں جنس (Sex) موضوع کے طور پر زیر بحث آتا ہے اور ناول کے تار و پود پر اسکی چھاپ گہری رہی ہے۔ حالانکہ مجموعی سطح پر انسان کی دیوانگی میں جنسی عوامل کے ساتھ ساتھ دوسرے کئی پہلو بھی کارفرما ہوتے ہیں لیکن بانو قدسیہ نے زن' زر اور زمین کی تثلیث میں سے زن (Sex) ہی کو چنا ہے اور حرام سطح پر مرد و زن کے باہمی جنسی روابط سے دیوانہ پن کے اثرات و مہیجات کی نشان دہی کی ہے اور اس ضمن میں سستی لذتیت اور ہیجان کو بھی نہیں ابھرنے دیا۔ بانو قدسیہ نے جسمانی تعلقات کو جنسی سائنس کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس نے سکس کو کمرشل ٹول کے طور پر تو برتا ہی ہے مگر بڑی بات ہے کہ سکس جیسا موضوع اس چابکدستی سے ناول میں سمو دیا گیا ہے کہ عضو تناسل' زنا' مقعد' بغل' ہومو سکس' Libido اور جسم کے بلیک ہال' جیسے الفاظ آسانی سے کھپ گئے ہیں۔ یوں جنسی تذکرے کو فحاشی کے بجائے گہرا نفسیاتی اعتبار ملا ہے 'البتہ تنتر ایوگا' کرم یوگا' سرنایام' کنڈالنی' مولادھارا' سودا ہیں تھانہ' انا ہاتا' شکتی شوا' وشودھا اور اس قبیل کی دیگر اصطلاحات اور اکی مختصر تشریحات پڑھنے والے کی معلومات میں اضافہ تو کرتی ہیں مگر ناول کو ناول کے منصب پر متمکن ہونے میں رکاوٹ کا باعث بنتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ناول ریسرچ ورک تو نہیں ہوتا کہ موضوع سے متعلقہ ادھر ادھر کا سارا مواد اپنے اندر سما لے۔ قرۃ العین حیدر نے ۱۸۵۷ء سے موجودہ عہد تک کے ہندوستان کے نسلی ڈرامے میں ایک ہیئت سے دوسری ہیئت میں بدلتے تاریخی اور تہذیبی حقائق کو اپنے ناول

گردش رنگ چمن " کے قالب میں اس طرح آمیز کر کے پیش کیا ہے کہ ناول میں ان کی موجودگی گوشت میں ناخن کی طرح پیوست نظر آتی ہے ۔ فکشن میں علمیت کا اظہار قابل اعتراض نہیں مگر سلیقہ بنیادی شرط ہے ۔ اگر محض معلومات ہی بہم پہنچانی مقصود ہوں تو ناول کی صنف ہی کو کیوں منتخب کیا جائے ' بانو قدسیہ نے البتہ ان مقامات پر ' جہاں مختلف ادوار کے رنگ روپ کا تذکرہ ہے ' سلیقے سے کام لیا ہے ۔

راجہ گدھ ' میں جیناتی تبدیلی کا فلسفہ جاذب نظر ضرور ہے لیکن عقلی اور حیاتیاتی اعتبار سے درست نہیں ۔ چوری شدہ آٹے کے غذائی اجزا میں حرام کے جرثومے نہیں ہوتے ' کسی لیبارٹری میں ان جرثوموں کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا ۔ آٹے کی روٹی ' خواہ کسی ولی کے لنگر خانے کی ہو یا ابلیس کے آستانے کی ' بہرحال اسکے غذائی عناصر میں فرق کرنا ناممکن ہو گا ۔ سو معدے کے نظام انہضام کے مطابق کوئی بھی حلال یا حرام خوراک جو حیاتین ا ' ب ' ج اور د ' سے بھرپور ہو گی ' انسان کے جسمانی نشوونما میں تو یقینی طور پر مدد دے گی ' ہاں یہ ضرور ہے کہ اخلاقی سطح پر چوری کا فعل حرامکاری کے زمرے میں داخل ہو گا ۔

روحانی و مذہبی سطح پر بھی اس فلسفے کی وہ صورت نہیں بنتی جو ناول میں نظر آتی ہے ۔ ہر انسان اپنے اعمال و افعال کا خود ذمہ دار ہے ' باپ اپنے بیٹے کے عیوب کا ذمہ دار نہیں ہے ' اسی لئے مجرم کو انفرادی طور پر سزا دی جاتی ہے ۔ یہ نہیں کہ جرم تو بیٹا کرے اور سزائیں اس کے باپ کو دی جائے کہ اس نے بیٹے کے توارثی عنصر یا gene میں خرابی پیدا کی ۔ یہاں یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ اس نے بیٹے کو اچھے ماحول میں پروان نہ چڑھایا جس کے باعث وہ مجرم بنا ۔ اگر سارا مسئلہ جیناتی تبدیلی یا gene mutation ہی کا ہے تو عالم انسانی میں کوئی قصوروار نہیں ٹھہرتا ' نہ ہی قابیل مجرم ٹھہرتا ہے جس نے ہابیل کو قتل کیا ' نہ ہی نوح کا بیٹا جس نے باپ کی نافرمانی کی اور نہ ہی یوسف کے بھائی جنہوں نے اسے بیچ ڈالا ظاہر ہے کہ قابیل ' نوح کے بیٹے اور یوسف کے بھائیوں سے gene mutation کے تحت جرم سرزد نہیں ہوئے تھے بلکہ ان تمام واقعات کے پس پردہ حسد ' غرور ' رقابت اور ذاتی اغراض کا سلسلہ ہی کارفرما تھا ۔ اگر gene mutation کے فلسفے کو درست مان لیا جائے تو آدم کے شجر ممنوعہ کھانے کے بعد نسل انسانی کے گناہ و ثواب کا سارا معاملہ ہی چوپٹ ہو جاتا ہے ۔ دراصل بانو قدسیہ نے پروفیسر سہیل کی زبانی جیناتی تبدیلی کا فلسفہ بیان کر کے گناہ کو مربوط اور اجتماعی شکل میں دکھانے کی سعی کی ہے تاکہ زانی زنا کرتے وقت خوف زدہ رہے کہ اس کے نطفے سے لولا اور لنگڑا بچہ بھی متولد ہو سکتا ہے اور اس طرف بھی دھیان دلایا ہے کہ مادی رزق کے حرام استعمال سے بھی توارثی عنصر میں انتشار پیدا ہونے کا امکان موجود ہوتا ہے ۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ نطفہ حرام سے جنم لینے والا بچہ کسی طور پر بھی قصوروار نہیں گردانا جا سکتا اور نہ ہی اس کے خلیاتی خمیر میں بدی کی کثرت قرار دی جا سکتی ہے اگر یہ بچہ بالغ ہو کر ٹینشن یا ذاتی دباؤ کا شکار ہوتا ہے اور اپنے وجود کو گناہ کا ثمر قرار دیتا ہے تو یہ اس کا ماحولیاتی تفکری ہے جو اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیتا ہے ۔ یہی بچہ بہتر تربیت اور پاکیزہ ماحول کے باعث نیکوکار بھی بن سکتا ہے ۔ جیناتی اثرات کسی حد تک انسان کے خون میں شامل ہو سکتے ہیں مگر اتنی مقدار میں نہیں کہ ماحولیاتی اثرات پر بھی حاوی ہو جائیں اور ذہن انسانی کے لئے ذاتی فہم کے مطابق رد و قبول کی کوئی صورت ہی باقی نہ بچے ۔ بہتر ماحول اور راست تربیت کے ذریعے بچے کی شخصیت میں یکسر

تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔

جنیاتی اثرات کے تحت انسانی بچے کو اپنے خاندان اور ماں باپ کی طرف سے بدنی شکل و شباہت اور رنگ روپ کا کچھ حصہ منتقل ہو سکتا ہے مثلاً ناک، کان، ماتھا، ٹھوڑی، بالوں کے رنگ یا دیگر اعضا میں سے کسی ایک یا ایک سے زیادہ عضو کی مماثلت پیدا ہو سکتی ہے، اگرچہ یہ توارثی کلیہ بھی حتمیت نہیں رکھتا، اسی طرح بعض اوقات موروثی بیماریوں کے حملے کا امکان بھی ہو سکتا ہے لیکن ذہن انسانی اپنی ساخت و بافت کے لحاظ سے بڑی حد تک ایک الگ چیز ہے جس پر معاشرتی اقدار و معائیر اور مشاہدہ و مطالعہ کے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور یہ مسلسل ارتقا و تغیر کے عمل سے گزرتا رہتا ہے۔ اس اعتبار سے ذہن انسانی پر جنیاتی اثرات کا کلی تصرف ایک ناممکن سی بات ہے کہ اس میں محض تقدیر پرستی کا خطرہ غالب رہتا ہے۔ جزوی تصرف کی صورت بھی قدرے مشکوک ہے۔ سو زیر بحث ناول میں جنیات کے حوالے سے جو ایک خاص طرز کی قدریت کا فلسفہ پیش کیا گیا ہے، وہ غلط ہونے کے باوجود ایک خود تراشیدہ خواب کی مانند ضرور نظر آتا ہے جسے بانو قدسیہ نے پورے عالم انسانی کے لئے دیکھا ہے اور جس کے ذریعے اس نے مقاطعہ گناہ کا درس دیا ہے۔

دم کیا ہوا پانی ہمارے اعتقادات کے سبب ہی بھاری بھاری محسوس ہوتا ہے۔ اسرائیل میں اگر آج بھی سپر نارمل لوگ پیدا ہوتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں کہ ان کی پرانی نسلوں نے من و سلویٰ جیسا پاک رزق کھایا ہے۔ اگر سپر نارمل ذہن کو من و سلویٰ اور بہشت کی صالح خوراک کا نتیجہ قرار دیا جائے اور ایب نارمل ذہن کو شجر ممنوعہ یا حرام رزق کا ردعمل کہا جائے تو لامحالہ یہ توجیہات ہمیں مطمئن نہیں کر سکیں گی۔ دراصل بانو قدسیہ نے ذہن انسانی کو اجتماعی سطح پر حرام سے دور ہونے کی طرف مائل کیا ہے۔ انسان تضادات کا مجموعہ ہے۔ بانو قدسیہ نے متضاد، انسان کی مختلف نفسی جبلت پر خامہ فرسائی کی ہے۔ سیمل، عابدہ، قیوم، آفتاب، یعنی اور امتل، ذہانت کی عام اور خاص سطحوں پر یہ سب کردار اپنی ذات کے انتشار کا شکار ہیں، اگلی ساجھی اضدادو کی گرفت میں ہے۔ سو یہی اضدادو ان کی ذہنی کج روی کا پیش خیمہ بنتی ہیں۔

قیوم کو اپنے گدھ جاتی ہونے کا اعتراف ہے۔ ناول کے آخر میں وہ خود کو پاگل پن کی پہلی اور اسفل ترین سیڑھی پر مجوب کھڑا پاتا ہے۔ وہ یعنی، عابدہ اور امتل کے ساتھ جسمانی تعلق کو حرام تعلق سمجھتا ہے۔ یہ باسی تعلقات اسے لذت عطا نہیں کرتے۔ مردہ اور زندہ جسم، سرد اور گرم خون کے مابین فرق کا بھی اسے علم ہے۔ سو اعتراف کرنے والا السر کا مریض انسان کا وہ روپ ہے جس سے نفرت نہیں کی جا سکتی۔ ناول پڑھ کر راجہ گدھ اور قیوم کے لئے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ بانو قدسیہ نے قیوم کو ایک نارملٹی کا پیکر بنایا ہے اور افرائیم کو سوپر نارملٹی کی صورت دی ہے اور ناول کو ایک سوالیہ جملے پر ختم کیا ہے۔ وہ جملہ یوں ہے۔

"انسان کو ایک نارمل سے سوپر نارمل تک پہنچنے کے لئے" جانے ابھی کس کس منزل سے گزرنا ہے۔"

میرے خیال میں انسان کی منزل سوپر نارملٹی نہیں ہے۔ خدا نے انسان کو احسن فطرت پر خلق کیا ہے۔ انسان کا ذہنی ارتقا اس امر میں مضمر ہے کہ وہ آہستہ آہستہ اپنی ذات کی تطہیر کرے اور اپنے آپ کو اس مقام تک لے جائے

جہاں سے فطرت احسن کا سلسلہ شروع ہوتا ہے ۔ سو انسان کو مافوق الفطرت ہستی نہیں بنتا' اس نے ہوا میں اڑ کر شعلے نہیں پھانکے ' اسے دورے کی حالت میں بعید از قیاس یا قریب از قیاس بے ربط جملے بھی نہیں بولنے اور نہ ہی خوابوں کی آخری سیڑھ پر سربسجود ہونا ہے ۔ اصل میں انسان کی منزل بیسٹ نارملٹی ہے ۔ یہی وہ منزل خرد ہے جہاں حواس باختگی کی بیماری سے دور رہ کر سوجھ بوجھ کے ساتھ بہتر فیصلے کئے جا سکتے ہیں اور صالح معاشرے کا سنگ بنیاد رکھا جا سکتا ہے ۔ افرایم جیسا بچہ انسان کا ارتقائی روپ نہیں ہو سکتا۔ ایسے پیرانارمل لوگوں کی ایک الگ پٹی تو ضرور بنائی جا سکتی ہے ۔ ان کی حرکات و سکنات اور باتوں پر غور و خوض بھی کیا جا سکتا ہے مگر ان کو انسان کا مستقبل کسی صورت میں بھی قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ یہی وہ مغالطہ ہے جو بانو کے نئے صوفی ازم کی بنیاد بنا ہے ۔ البتہ قیوم اس منزل فکر پر ضرور جا پہنچا ہے جہاں گناہ اور حرامکاری کا احساس شدت اختیار کر جاتا ہے اور ذہن نیکی و بدی کے درمیان واضح فرق محسوس کرنے لگتا ہے ۔ چند مثالیں دیکھئے ۔

" اس وقت میں سیمی کے کف اوپر کر رہا تھا ۔

معاً میرے دل میں خیال آیا کہ قلب کا راستہ جسم سے ہو کر نہیں گزرتا ۔ قلب تک پہنچنے کے لئے صرف وجدان ' ٹیلی پیتھی ' ہپ نوٹزم ' مسمریزم کی ضرورت ہے ۔ جسم روحانی عمل کو زمین میں ارتھ کر دیتا ہے ۔ میں نے بڑے تقدس سے سیمی کے کف بند کئے اور دل میں عہد کیا اب کبھی میں اس سے نہیں ملوں گا ۔ "

O

" یہ صرف گدھ جاتی کی عقل ہے کہ وہ مرے ہوؤں سے زندگی کا وعدہ کرتے ہیں ۔ اس وقت میرے پاس کچھ نہ تھا ۔ صرف ہمدردی کا ست رنگ جال ۔ آفتاب نے یہ غزال شرشکار کیا تھا ۔ مجھے اس مردہ لاش کو کھانے کا حکم تھا ۔ "

O

" اپنا جسم میرے سپرد کرنے سے کچھ لمحے پہلے وہ طمانیت فرقے میں داخل ہو گئی اور دیکھتے دیکھتے شہیار سے بے دیار ہو گئی ۔ "

O

قیوم کا کردار جدید عہد کے انسان کا کردار ہے جو کئی ماخولیاتی و تہذیبی ادوار سے گزرا ہے اور اس فکری نہج پر آپہنچا ہے جہاں حرام و حلال کی حقیقت کھل کر سامنے تو آجاتی ہے مگر اس وقت علت راسخ ہو کر جبر کی صورت اختیار کر جاتی

ہے جس سے چھٹکارا پانا بھی مشکل ہوتا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں انسان عادت کا گلا گھونٹ کر نیا سفر شروع کر سکتا ہے بانو قدسیہ نے ایک مخصوص قسم کا اخلاقی نظام وضع کر کے انسان کو اسی نئے سفر کے لئے کربستہ کیا ہے۔

فکری اختلافات اپنی جگہ ' اپنے موضوعی تعامل کے حوالے سے یہ ناول ایک منفرد اور اچھوتا اسلوب بناتا ہے اور دیگر اردو ناولوں کی تکنیک سے الگ خدوخال استوار کرتا ہے۔ ناول کی زبان پاکستان کی وہ پنی تلی اور نئی اردو زبان ہے جسے ہمارا انٹی لیکچوئل طبقہ برت رہا ہے ' جس میں غیر ضروری انشاپردازی سے کام بھی نہیں لیا جاتا اور زبان کا حسن بھی مجروح نہیں ہوتا۔ پہلی مرتبہ بانو قدسیہ نے ناول کو " آگ کا دریا " اور " اداس نسلیں " کے ہئیتی اور اسلوبیاتی گھیرے سے باہر نکالا ہے اور ناول میں فکری رجحانات کو فروغ دینے کی راہ ہموار کی ہے۔

سہ ماہی " ادبیات " کے لئے لکھنے والوں سے التماس ہے کہ اپنے مسودات صاف صاف کاغذ کے ایک طرف ' مناسب حاشیہ اور سطروں کے درمیان فاصلہ رکھتے ہوئے لکھیں اور عکسی نقل کی بجائے اصل مسودہ اپنے تازہ ترین پتے کے ساتھ ارسال فرمائیں۔
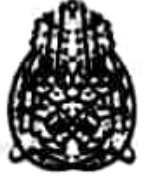
مدیر

شمارہ : ۱۳-۱۴-۱۵ جلد ۴

مدیر مسئول
غلام ربانی آگرو

مدیر اعلیٰ
خالد اقبال یاسر

اکادمی ادبیات پاکستان ◎ اسلام آباد

سہ ماہی
ادبیات